محمد حنیف ندوی
اورینٹل

تاثرات

ابھی فلسفہ کانگرس ڈھاکہ کا اجلاس ہر طرح شاندار رہا۔ ڈاکٹر دیوا اور ان کے محترم رفقاء اور تلامذہ نے جس گرم جوشی اور اخلاص سے مہمانوں کی خدمت کی اور جس فیاضی سے عشائیے اور عصرانے ترتیب دئے، اس کے لئے ہم سب ان کے بدرجہ غایت ممنون ہیں۔ مضامین اور مقالوں کا معیار بھی اس دفعہ اونچا رہا۔ اور یہ دیکھ کر تو دلی مسرت ہوئی کہ ہمارے ہاں کے نوجوان اہلِ علم میں فلسفہ کا گہرا ذوق پیدا ہو رہا ہے۔ اور حکمت و دانش سے ان کا لگاؤ اس درجہ ترقی پذیر ہے، کہ درس و تدریس کی ذمہ داریوں کے باوجود فکر و مطالعہ کے لئے یہ کچھ فرصتیں تلاش کر لینے میں کامیاب ہو ہی جاتے ہیں۔ فکر کی یہ بیداری اور فلسفہ ایسے خشک مضمون کے ساتھ یہ شغف نہایت مبارک ہے۔ کیونکہ اس کے یہ معنی ہیں کہ استحصال اور تن آسانی کے اس دور میں بھی کچھ لوگ ایسے ہیں جو علم و فن کی مشعلوں کو فروزاں رکھنے میں مصروف ہیں۔ اور جو نہیں چاہتے کہ ان کا ملک کم از کم فکری حد تک افلاس و جہل کی چیرہ دستیوں کا شکار رہے۔ کانگرس کی اس کامرانی کے پہلو بہ پہلو اس خلا کو بھی محسوس کیا گیا جو خلیفہ صاحب اور قاضی اسلم صاحب کے شریک نہ ہونے سے اُبھر آیا تھا۔

یوں تو اکثر مقالے قابلِ قدر تھے مگر بروہی صاحب کا خطبہ صدارت خصوصیت سے پسند کیا گیا۔ اور لوگوں کی پہلی مرتبہ معلوم ہوا، کہ ایک کامیاب ایڈووکیٹ اور ہمارا سابق وزیر قانون نہ صرف اصطلاحی معنوں میں فلسفی اور حکیم ہے بلکہ زندگی کے بارے میں اپنے مخصوص نظریات بھی رکھتا ہے۔ جن میں پختگی، مطالعہ اور گہرائی سبھی کچھ ہے۔ سب سے بڑی بات جو ان کے خطبہ کا مابہ الامتیاز تھی وہ یہ تھی کہ اُنہوں نے جو کچھ بھی کہا رسماً نہیں کہا۔ اور محض صدر ہونے کی حیثیت سے نہیں کہا۔ بلکہ ایک داعی ایک مبلغ اور مشنری کی حیثیت سے کہا۔ اس میں فلسفہ کی بلند پروازی اور حکمت کی استواریاں بھی تھیں۔ اور دل اور روح کی صدائے بازگشت اور قلب و باطن کی خوابیدہ پکار بھی!

ان کے گرانمایہ خطبۂ صدارت کا محوری نقطہ یہ تھا کہ تہذیب انسانی اس وقت تک استحکام حاصل نہیں کر سکتی اور اس وقت تک اس کا سرسبز و شاداب ہونا ممکن نہیں جب تک کہ اس کی بنیادیں روح پر مبنی نہ ہوں۔ اور جب تک کہ علم و فکر کے قافلے اس اقلیمِ نہانی کی وسعتوں کا جائزہ نہ لیں۔ ان کی رائے میں انسانی نفس

اپنے اندر ایسی حیرت انگیز صلاحیتیں رکھتا ہے کہ اگر ان کو مناسب جلادی جائے، اور چمکانے اور سنوارنے کی سائنٹیفک جدوجہد جاری رکھی جائے۔ تو حقائق اشیاء کی گرہیں خود بخود کھلنا شروع ہو جائیں گی اور انسان زندگی کے اونچے اور لطیف تر تقاضوں کا براہِ راست اور قریب سے مشاہدہ کر سکے گا۔ اُن کا نقطہ نگاہ اس ضمن میں یہ ہے۔ کہ جب تک انسان خارج کے سیمیاء و سحر سے چھٹکارا حاصل کر کے باطن کی غواصی نہیں کرتا شعور کی عمیق ترین تہوں میں نہیں پیرتا۔ اور عالمِ روح و معنی میں دوسرا جنم نہیں لیتا۔ اس وقت تک کسی بھی پائدار اور محفوظ تہذیب و ثقافت کا تصوّر نہیں کیا جا سکتا۔ فلسفے سے ان کی یہ بجا توقع ہے کہ اگر اس کی نقطہ آفرینیوں کا موجودہ رُخ موڑ دیا جائے اور اس سے زندگی کی عقدہ کشائیوں کا صحیح صحیح کام لیا جائے تو یہ انسان کی اس نشاۃ ثانیہ یا عالم روحانی میں اس کی جدید بعثت کے سلسلہ میں ایک اچھے طبیب اور معاون کا فرض انجام دے سکتا ہے۔

خطبے کے باقی حصّے اسی دعوے اور اسی مرکزی خیال کو ثابت کرنے کی منطقی کوششوں پر مشتمل ہیں۔ جن میں خیالات کی بلندی کے ساتھ ساتھ زبان کی پاکیزگی اور انگریزی پر ان کا بے مثل قابو اس انداز کا ہے کہ جس سے پورے خطبہ نے ادب کے بہترین مرقع کی حیثیت اختیار کر لی ہے۔ ہم قارئینِ کرام سے درخواست کرینگے۔ کہ اگر وہ اس کا پورا پورا لطف اُٹھانا چاہتے ہیں۔ تو فیلاسافیکل کانگرس کے سکرٹری سے اصل خطبہ منگا کر ضرور پڑھیں۔

کیا ہمارے وجدان و حدس میں علم و عرفان کے سرچشمے بہ رہے ہیں؟ اور باطن کی اندرونی دنیا میں ادراک و عرفان کے حسین جزیرے آباد ہیں۔ اور آیا انسان ان جزائر تک رسائی حاصل کر سکتا ہے؟ اور حواس و تجربہ کے آگے بھی کچھ منزلیں وقوف و آگاہی کی فرض کی جا سکتی ہیں؟ یہ ہیں وہ سوالات جن سے بروہی صاحب نے تفصیل سے تعرض کیا ہے۔ ان کے نزدیک کانٹ کا تصوّرِ علم صحیح ہے۔ اور یقیناً بظاہر انسان کی فکری سطح تجربہ و احساس کی بنیادوں ہی پر قائم ہے۔ لیکن فکر کی یہ سطح ترقی پذیر ہے اور اس کو اس سے کہیں زیادہ اونچا اٹھانا اور اس کے حدود کو کہیں آگے تک پھیلانا ممکن ہے۔ بلکہ اس کو بدلا تک جا سکتا ہے۔ کانٹ کے نظریہ علم پر ولیم جیمس کا یہ اعتراض بڑا وزنی ہے کہ اس سے مذہبی و دینی تجربات کی قطعی تشریح نہیں ہو پاتی۔ کیونکہ مذہب جن حقائق کو پیش کرتا ہے اور زندگی کے جس زاویہ نظر کی تائید کرتا ہے ان کو عقل و تجربہ کی محدود کسوٹیوں سے جانچنا محال ہے۔ ان کے نزدیک ان حقائق سے وقوف حاصل کرنے کے لئے ایک دوسری قسم کی روحانی و باطنی تربیت کی حاجت ہے اور حواس کی سرحدوں سے آگے متصوفانہ اور پیغمبرانہ بصیرت کی ضرورت ہے۔ کہ جو ان سے براہِ راست مشاہدہ و تجربہ کا تعلق رکھتی ہے۔

ایک اہم سوال یہ ہے کہ کیا جس طرح تجربی علوم کی برکات عام ہیں اور آج ہر ہر شخص ان اکتشافات سے فائدہ اُٹھا رہا ہے۔ اور تہذیب و تمدّن کا ہر ہر گوشہ ان سے تاثر پذیر ہے کیا روح کی فتوحات بھی عام ہو سکیں گی، اور ان سے بھی زندگی کو بدلنے اور اونچا اُٹھانے میں مدد مل سکے گی۔ اور کبھی ایسا وقت بھی آئے گا کہ روحانی ارتقاء کی بدولت حیاتِ انسانی زیادہ بے خطر، زیادہ پاکیزہ اور لطیف قالب اختیار کرلے، اور انسانی علم و بصیرت کی موجودہ مجبوریاں اور حد بندیاں ختم ہو جائیں۔ اور انسان اس لائق ہو جائے۔ کہ حقائق اشیاء سے براہِ راست رابطہ قائم کر سکے۔ بروہی صاحب کے نقطۂ نظر سے ایسا ہونا ممکن ہے۔ کوشش شرط ہے۔ جب ہم روح کی نشاط انگیز وادیوں میں قدم دھریں گے۔ سیر باطن میں مصروف ہونگے اور اُس راہ کے مسافر بننا چاہیں گے۔ تو کوئی وجہ نہیں کہ اس کی برکات سے اپنا دامن طلب نہ بھریں اور جو کچھ ہاتھ آئے اس کو بنی نوع انسان کے لئے عام نہ کریں۔

اس سے بھی زیادہ اہم سوال یہ ہے کہ ارتقاء روح کی یہ مسافت طے کون کرے؟ اور کس گروہ سے اس نوع کی توقعات وابستہ کی جائیں؟ کیا یہ روحانی انقلاب خود بخود اور آپ سے آپ حیاتیاتی ارتقاء سے معرضِ ظہور میں آجائے گا، اور انسان کی فکری صلاحیتیں، اس میں ایسی عضویاتی اور نفسی تبدیلیاں پیدا کردیں گی کہ جن سے اس کے مشاہدات کا دائرہ وسیع تر ہو جائے گا۔ جیسا کہ ڈاکٹر بیوک وغیرہ کا خیال ہے۔ یا پھر متصوفانہ تجربات کے بل بوتے پر آگے بڑھنا چاہئے۔ اور وہی طریقِ عمل اختیار کرنا چاہئے جو بڑے بڑے صوفیاء نے وقتاً فوقتاً اختیار کیا ہے۔

جہاں تک جناب بروہی کا تعلق ہے ان کو ان دونوں نقطہ ہائے نظر سے اختلاف ہے۔ اور اس اختلاف میں یہ حق بجانب بھی ہیں۔ حیاتیاتی ارتقاء کا ذکر کرتے ہوئے ان کا کہنا ہے۔ کہ اس طرح جو علم حاصل ہوگا، وہ سراسر میکنیکل ہوگا اور اس کا دائرہ کار بھی زیادہ پھیلا ہوا نہیں ہو سکے گا۔ زیادہ سے زیادہ انسان اس کے ذریعہ دور کی آوازیں سن سکے گا۔ دور کی چیزوں کو دیکھ سکے گا۔ اور دل کے خطرات سے آگاہ ہو سکے گا۔ اور ظاہر ہے کہ یہ شعبدہ طرازی تو مقصود نہیں۔ مقصود تو اس کے برعکس یہ ہے، کہ اس میں خود آگاہی اور خود نگری کے احساسات بیدار ہوں۔ اور یہ شعور و ادراک کی وساطت سے کائنات سے ہم آہنگ ہو سکے۔ اور الٰہیات کی گتھیوں کو سلجھا سکے۔

متصوفانہ طریق پر ان کا اعتراض یہ ہے۔ کہ صوفی ہمیشہ جذبہ و تواجد کی راہ سے حقائق سے دوچار ہونے کی کوشش کرتا ہے۔ اور اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے، کہ ایک خاص انداز کی طمانیت قلبی سے بہرہ مند ہونے کے بعد آگے نہیں بڑھ پاتا۔ اور یہ نہیں بتا پاتا کہ اس عالمِ ظواہر کا اس حقیقت مطلقہ سے کیا رشتہ و تعلق ہے؟ یعنی اس کی جدوجہد یکسر منفی رنگ کی ہوتی ہے اور یہ محض تواجد و شوق کے داعیات کی تسکین چاہتا ہے اور بس۔ علاوہ ازیں

یہ جن حقائق و معارف کو محسوس کرتا ہے اس کے اظہار کے لئے اس کے پاس سچی تلی، واضح اور حکیمانہ زبان نہیں ہے۔ کہ جس میں یہ اپنے اکتشافات روحی کو منتقل کر سکے۔ اور آیندہ نسلوں تک پہنچا سکے۔ یہی وجہ ہے کہ صوفیاء کی تگ و دو، اور خیالات و افکار سے علم کا قافلہ مطلق آگے نہیں بڑھا ہے اور انسانی علم میں سوا اسرار و رموز، اور مبہم اشارات و کنایات کے کوئی قابلِ قدر اضافہ نہیں ہو پایا ہے۔

بروہی صاحب کا خیال ہے کہ فلسفہ اور صرف فلسفہ اس منزل عزیز تک ہمیں پہنچا دینے کا ذمہ دار ہو سکتا ہے۔ بشرطیکہ موجودہ شعور کی اسیری سے ہم رستگاری حاصل کر لیں اور وجدان و حدس کے دروازوں کو کھٹکھٹائیں۔ ادراک کی بالائی سطحوں کو چھوڑیں اور اس کی گہرائیوں میں غوطہ زنی کریں۔ اپنی ذات سے اونچا اُٹھیں اور یقین رکھیں کہ نفس حیوانی کو بھی نفس ملکی کی خصوصیات حاصل کرنا ہے۔ اور اس عبوری دَور سے نکلنا ہے۔ فلسفہ سے ان کی توقعات اس بنا پر وابستہ ہیں۔ کہ اس میں فکر و تصوّر کا انداز منطقی ہے۔ اس کی جانچ پرکھ کے پیمانے مقرر ہیں۔ اور اس کے پیش کردہ نتائج کو نقد و تحلیل کی کسوٹیوں پر جانچا جا سکتا ہے۔ پھر اس کی ایک زبان ہے جس نے دو ڈھائی ہزار برس کے ارتقاء سے ایک متعین قالب اختیار کر لیا ہے۔ اس لئے اگر ایک شخص اس راہ میں حقائق و اکتشافات کا سامنا کریگا۔ تو ان کو الفاظ و حروف کا واضح جامہ بھی پہنا سکیگا۔ اور اس سے فائدہ یہ پہنچے گا کہ علم ذاتی اور انفرادی گرفت سے آزاد ہو جائے گا یعنی یہ نہیں ہوگا کہ اس کی برّاتی و معانی سے صرف شیخ کا سینہ ہی روشن ہو۔ بلکہ اس کی تجلیات بوقلموں میں عام بنی نوع انسان کا بھی معتدبہ حصّہ ہوگا۔ اور اس طرح وجدان و باطن کی فتوحات سے ایک نئی تہذیب، ایک نئی زندگی اور نئے عہد کی بنیاد رکھی جا سکے گی۔ جو ایٹمی عہد سے کہیں زیادہ مستحکم و پائدار رہو گا۔

بروہی صاحب کی روح کی طرف پیش قدمی کی یہ دعوت، کوئی بالکل ہی نرالی چیز نہیں ہے۔ جاننے والے جانتے ہیں کہ غزالی، رومی اور برگسان وغیرہ نے اپنے اپنے انداز میں قریب قریب یہی کچھ کہا ہے۔ لیکن اس میں شبہ نہیں کہ اُنہوں نے ان خیالات کو جس سلیقے، اپج اور مخصوص سیاق میں بیان کیا ہے وہ بجائے خود قابلِ قدر اور لائق صد ستائش ہے۔ اور اس سے غور و فکر کی نئی نئی راہیں کھلتی ہیں۔